مباحث

تفہیمِ اقبال کے مسئلے

(گفتگو)

شرکائے گفتگو:
عرفان صدیقی، شمس الرحمٰن فاروقی، نیر مسعود

پہلی نشست

عرفان صدیقی: کلام اقبال کی تفہیم کے سلسلے میں جو چیز سب سے پہلے ذہن میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ ان کے یہاں تاریخی، مذہبی، اساطیری اور ایسی طرح کے حوالے تلمیحات اور استعارے اتنی کثرت سے ملتے ہیں کہ لگتا ہے جب تک ان سے پوری طرح واقفیت نہ ہو اس کلام کی تہہ تک پہنچنا مشکل ہوگا۔ اقبال کے یہاں یہ حوالے دوسرے شاعروں کے مقابلے میں زیادہ ہیں۔ اُن کی بہت سی شاعری مختلف رجحانات، تحریکوں اور تاریخی واقعات سے کوئی ربط اور سلسلہ رکھتی ہے۔ مثلاً جب ہم پڑھتے ہیں:

''لے گئے تثلیث کے فرزند میراث خلیل
خشت بنیاد کلیسا بن گئی خاکِ حجاز
ہو گئی رسوا زمانے میں کلاہِ لالہ رنگ
جو سراپا ناز تھے، ہیں آج مجبور نیاز''

تو ''کلاہِ لالہ رنگ'' کو صرف سُرخ رنگ کی ٹوپی سمجھ لینے سے کام نہیں بنتا۔ جب تک آپ کو یہ معلوم نہ ہو کہ خلافت عثمانیہ کا زوال کس طرح ہوا اور اس میں انگریزوں کا کیا کردار رہا تھا، اُس وقت تک 'کلاہِ لالہ رنگ' ترکی ٹوپی، کے رسوا ہونے کا مفہوم روشن نہیں ہوتا۔ فاروقی صاحب، آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا ان حوالوں کو سمجھے بغیر کلام اقبال کی علیحدہ سے تفہیم ممکن ہے؟

شمس الرحمٰن فاروقی: اس میں شک نہیں کہ جیسا آپ نے فرمایا، اقبال کے یہاں تاریخی اشارے، علمی اشارے، فلسفیانہ اشارے کثرت سے ہیں اور جب تک ان سے کچھ نہ کچھ واقفیت نہ ہو تب تک بہت سے اشعار کا مفہوم سمجھ میں نہیں آتا، اور اس میں تو کوئی شک ہی نہیں کہ ان اشعار کی بڑائی اور عظمت سمجھ میں نہیں آتی۔ ایک مشکل اور بھی ہے، اس سے زیادہ وہ اس وقت پیش آتی ہے جب تاریخ اور فلسفے کا وہ تصور جو اقبال کے ذہن میں تھا، اس سے واقفیت نہ ہو، کیونکہ یہ تو ممکن ہے کہ جو واقعات ہیں، وہ تاریخ میں لکھے ہوئے دیکھ لیے جائیں کہ انیس سو تین میں یہ ہوا اور چار میں یہ ہوا، اور سلطان عبدالحمید کو یوں معزول کیا گیا وغیرہ وغیرہ، یا حضرت ابوبکرؓ کا واقعہ یا جو بھی واقعہ سمجھ لیجیے۔ لیکن جیسے، ''غریب و سادہ و رنگیں ہے داستانِ حرم نہایت اس کی حسینؓ، ابتدا ہے اسمٰعیل'' اب اس

میں اسلامی اور مسلم تاریخ کا بھی ایک خاص نظریہ ہے، اس سے واقفیت چاہیے۔ مان لیجیے میں آپ کو بتا بھی دوں کہ صاحب، اس میں اسمٰعیل علیہ السلام کی اور حسین علیہ السلام کی قربانی کا جو معاملہ ہے، جو اُن کا کارزار تھا حق و باطل کا، وہ ہے۔ لیکن اس سب کے ساتھ ساتھ ایک پورا تاریخی پس منظر اور تاریخ کا ایک تصور بھی ہے اور وہیں پر مشکل آ پڑتی ہے۔ اب، مثلاً یہ کہ چونکہ ہم نے پچھلے پچاس ساٹھ ستر برس سے اقبال کا ایک طرح سے استحصال کر رکھا ہے؛ کچھ لوگ جو ایک خاص نظریے کے مالک ہیں وہ اقبال کو بھی اسی نظریے کا حامل سمجھنا چاہتے ہیں۔ کوئی انہیں انقلابی کہتا ہے، کوئی مسلم، **Chauvinistic**، کوئی کہتا ہے وہ پاکستان کے نظام کے گویا بانی تھے وغیرہ وغیرہ۔ کچھ لوگ جو اقبال کے مخالف ہیں، وہ کہتے ہیں کہ ان کے فاشسٹ خیالات ہیں، جنگ جویانہ خیالات ہیں، وہ امن کے مخالف ہیں، قوت کے حامی ہیں وغیرہ، تو یہاں مشکل آ پڑتی ہے کہ جب اقبال کا ایک تصور تاریخ ہے اور اس کو سمجھے بغیر ہم اُن کے کلام کی پوری معنویت کو نہیں سمجھ سکتے، تو اس تصور تاریخ کو ہم کیسے متعین کریں؟ چونکہ اقبال کے ساتھ **vested interest** بہت ہیں، اس لیے ـــــ۔ اب اگر اسی شعر کو آپ لے لیجیے ''غریب و سادہ و رنگیں ہے ـــــ۔'' تو اس میں سوشلسٹ قسم کا نقاد تاریخی اعتبار سے کچھ اور معنی بتائے گا، جو اسلام پسند ہے وہ کچھ اور معنی نکالے گا، جو اقبال کو قومیت پرست ثابت کرنا چاہتا ہے، کہ گویا وہ ہندوستان کی سالمیت کے معاملے میں کانگریس کی پالیسیوں کے حامی تھے، کم و بیش، وہ اور معنی نکالے گا۔ کتنے معنی نکالے کوئی۔ تو سب سے پہلے یہ طے کرنا ضروری ہے کہ اقبال کا اپنا تصور تاریخ تصورِ فلسفہ اور تصورِ فن کیا تھا اور اس کو ہم اپنے طور پر نہیں، خود اقبال کے اقوال، تصورات اور کلام سے نکالیں۔ ایک تو صاحب یہ مشکل ہے، دوسری مشکل یہ ہے کہ بہت ساری چیزیں جو اقبال نے پڑھی تھیں وہ ہماری دسترس میں نہیں ہیں۔ مثلاً ان کے وہ اشعار جو فلسفیوں، اسپنوزا، افلاطون، ہیگل وغیرہ یا شعرا، بائرن، براؤننگ وغیرہ کے بارے میں ہیں، اب وہ تو دو دو شعر لکھ کے چلے گئے ہیں، لیکن ظاہر ہے ان کے پیچھے خود اقبال کا پورا انیسویں صدی کے ذہنی مزاج کو سامنے رکھتے ہوئے مطالعہ تھا کہ اٹھارہ سو نوّے یا انیس سو چار، پانچ، دس کے قریب مغربی یورپ میں لوگوں کا بائرن کے بارے میں کیا خیال تھا، براؤننگ کے بارے میں کیا خیال تھا، اس سے واقفیت اگر نہ ہو تو پھر یہ اشعار ـــــ۔ آپ تعریف ضرور کر دیں گے۔ لیکن ان اشعار کی گہرائی تک نہیں پہنچیں گے۔ تو معاملہ صرف میکانیکی طور پر تلمیحات اور حوالوں کا نہیں ہے، بلکہ ان کے پیچھے جو تاریخی فلسفیانہ تصور اقبال کے ذہن میں تھا اس تک پہنچنے کا بھی معاملہ ہے۔

عرفان: فاروقی صاحب، آپ نے بہت صحیح فرمایا۔ اقبال کے یہاں بعض حوالے ایسے ہیں کہ محض تاریخی طور پر آپ انہیں تھوڑا سا **decode** کرلیں تو کام نہیں بنتا۔ مثال کے طور پر انہوں نے بہت سے مغربی مفکرین کے اقوال کا ایک طرح سے ترجمہ کر دیا ہے، جمہوریت کے بارے میں، آمریت کے بارے میں، فلاں اصول کے بارے میں، فلاں تحریک کے بارے میں، تو دیکھنا یہ ہے کہ اقبال کے پورے شعری، فکری نظام میں ان چیزوں کی اہمیت کیا ہے۔ مثلاً انہوں نے ایک جگہ کہہ دیا کہ صاحب وہ بھی ترجمہ ہے، کہ ''جمہوریت اک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں بندوں کو گنا کرتے ہیں، تولا نہیں کرتے''، درست کہا اچھا، اب مجھے یہ لگتا ہے کہ بہ ظاہر انہوں نے محض ترجمہ کر دیا ہے۔ لیکن دراصل یہ جمہوریت پر اُن کا **Comment** بھی ہے۔ اور جب **Comment** ہے تو اس میں شاعر کا اپنا نقطۂ نظر بھی شامل ہوگیا۔ نیر صاحب، آپ کا اس سلسلے میں کیا خیال ہے؟

نیّر مسعود: عرفان صاحب، ہمارے سامنے جو مسئلہ ہے وہ ایک تو اسی نقطۂ نظر کو سمجھنے کا ہے۔ اس کو ہم صحیح سمجھ رہے ہیں یا نہیں، یہ تو بعد میں۔۔۔۔ بلکہ وہ ہم قارئینِ ادب کا دردِ سر ہے بھی نہیں۔

عرفان: ہاں، بالکل صحیح ہے۔

نیّر: آپ نے صحیح فرمایا کہ اقبال کے یہاں مختلف قسم کے حوالے اور تلمیحات بہ کثرت ہیں۔ حوالے اور تلمیحات ہماری شاعری میں پہلے بھی بہت تھیں۔ یعنی علوم کا ایک وسیع قسم کا مطالعہ اپنی کلاسیکی شاعری کو سمجھنے کے لیے پہلے بھی ہمارے لیے ضروری تھا، تھوڑا بہت نجوم جانیں، کچھ طب جانیں، کچھ تاریخ، کچھ دینیات جانیں، لیکن وہ مطالعہ صرف شاعری کے حوالے سے تھا۔ مثلاً مانی پیغمبری کا مدعی اور ایک تحریک کا بانی تھا، اس سے ہم کو مطلب نہیں، ہم کو صرف یہ معلوم ہونا چاہیے کہ وہ چین کا بہت بڑا مصور تھا۔ حالانکہ نہیں تھا، چینی بھی نہیں تھا۔ لیکن اگر ہم کو اس قسم کا علم نہیں ہے تو ہم ناقص قاری ہیں اور ہم کو شاعری پڑھنے اور سمجھنے کا حق نہیں ہے۔ لیکن اقبال کو سمجھنے کے لیے اتنا ہی علم کافی نہیں ہے جتنا کلاسیکی شعری نظام کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے۔ اقبال کے مطالعے کے لیے ہمارا علم نہ صرف وسیع بلکہ گہرا بھی ہونا چاہیے۔ ہم صرف مانی کو نہ جانیں بلکہ ایران کی پوری ذہنی تاریخ سے بھی ہم کو تھوڑی بہت واقفیت ہو۔ گویا اقبال کو سمجھنے کے لیے ہمیں لُغت سے زیادہ انسائکلو پیڈیا دیکھنا ہوگا۔

فاروقی: جی ہاں، بہت خوب۔

نیّر: ترکانِ عثمانی کا ابھی ذکر ہوا تھا۔ ایک شعر مجھے بھی یاد آیا،

کوئی تقدیر کی منطق سمجھ سکتا نہیں ورنہ
نہ تھے ترکانِ عثمانی سے کم ترکانِ تیموری

اس شعر کی شرح بیخود دہلوی نہیں کر سکتے تھے، نہ بیخود موہانی کر سکتے تھے، نہ ہم کر سکتے ہیں جب تک ترکوں کی اس تاریخ سے واقف نہ ہوں جس کی طرف اشارہ کیا گیا۔ تو اقبال کی تفہیم کا ایک تو یہ مسئلہ ہے۔ یہ سیدھا سیدھا علمی مسئلہ ہے جس کے لیے میں نے عرض کیا کہ انسائکلو پیڈیا چاہیے اور یہ حل بھی ہوسکتا ہے۔ ایک اور بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اقبال فوراً آپ کو مرعوب کر کے مبہوت کر دیتے ہیں۔ خود اپنا تجربہ بتاؤں کہ بچپن میں اقبال کے کلام سے آشنا ہوا اور پہلی ہی بار میں اُن کے جو شعر دل پر نقش ہو گئے وہ تھے، ''دیکھ چکا المعنی شورشِ اصلاح دیں جس نے، نہ چھوڑے کہیں نقش کہن کے نشاں، چشم فرانسیس بھی دیکھ چکی انقلاب۔۔۔۔ وغیرہ تو اس سے مجھے غرض نہیں تھی کہ المعنی کسی آدمی کا نام ہے یا کوئی قوم ہے، یا فرانسیس کوئی شخص تھا یا کوئی ملک یا ملت ہے۔ اصلاح دیں کی شورش کیا تھی، اس سے مجھے کوئی مطلب نہیں تھا، بس شعر بہت عمدہ معلوم ہوئے اور دل میں اُتر گئے۔

عرفان: صحیح ہے۔

نیّر: تو ایک قاری گویا مطمئن ہو گیا۔ اب اسے کوئی فکر نہیں ہے اس لیے کہ وہ لطف اندوز ہو چکا۔ لیکن جب اسی کلام کی تفہیم کا معاملہ ہو تو پھر اب یورپ کی تاریخ سے واقف ہونا بھی ضروری ہو جائے گا۔ وہی بات آ گئی کہ اقبال کو سمجھنے کے لیے ہمیں دوسری طرح کا علم بھی درکار ہے۔ ایک اور مشکل اس وقت پیش آتی ہے جب ہم اپنے کلاسیکی شعری نظام کی مانوس چیزیں اقبال کے یہاں پاتے ہیں لیکن ان کو بھی سمجھنے میں ہمارا گذشتہ مطالعہ اور شعری مسلمات کا علم ہماری مدد نہیں کرتا۔ مثلاً سب سے سامنے کی چیز عشق۔ اقبال کے یہاں عشق کا ذکر تو بہت ہے لیکن یہ وہ عشق نہیں ہے جس سے ہم واقف چلے آ رہے ہیں۔ ''خواجہ'' اقبال کے یہاں کیا ہیں، ''ملا'' کیا ہیں، یہ مختلف قسم کے لوگ بن گئے ہیں۔ اقبال کو سمجھنے میں ایک مسئلہ یہ بھی ہے اور اس کا حل بھی بڑی حد تک اقبال کے کلام ہی میں موجود ہے۔ اقبال کے یہاں عشق کیا ہے، یہ معلوم کرنے کے لیے اقبال ہی کو پڑھیے۔ لیکن بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو صرف اقبال کو پڑھنے سے حل نہیں ہوں گی۔ گذشتہ گفتگوؤں میں ہم اس بات پر متفق ہوئے تھے کہ میر اور غالب کو سمجھنے کے لیے انہیں کو پڑھنا کافی ہے۔ لیکن اقبال کو سمجھنے کے لیے صرف اقبال کو پڑھنا۔۔۔۔

عرفان: ۔۔۔۔۔ کافی نہیں ہے۔

نیّر: بلکہ مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کچھ بھی پڑھنا کافی نہیں ہے۔

فاروقی: ایک بات مجھے اس میں اور کہنے کا خیال آیا۔ جیسا کہ نیّر صاحب نے فرق کیا، کہ بہت ساری معلومات ہیں جو کتابوں میں ملتی ہیں۔ انسائکلو پیڈیا وغیرہ ہم دیکھ سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ صرف اطلاع نہیں بلکہ اقبال کے کلام کو سمجھنے کے لیے کچھ علم بھی چاہیے۔ اب جیسا میں سمجھتا ہوں، علم سے مراد صرف یہ نہیں کہ صاحب، آپ نے فلسفہ پڑھا ہو، تاریخ پڑھی ہو، بلکہ عمومی طور پر ایک ایسا ذہن ہو جو علمی مسائل کو انگیز کر سکتا ہو اور علمی مسائل سے لطف اٹھا سکتا ہو۔ اگر لطف نہیں ملتا تو پھر مشکل ہو جائے گا کہ آپ اقبال کے کلام کو کسی صورت سے پسند کر سکیں۔ بہت سے لوگ جو اقبال کے شاکی ہیں انہوں نے کہا صاحب دیکھیے یہ تمام اونچی اونچی باتیں کرتے ہیں، بڑی بلند آہنگی ہے۔ مگر دل کو چھونے والی بات نظر نہیں آتی۔ تو یہ بھی ایک مسئلہ ہے کہ دل کو چھونے والی بات اقبال کے یہاں ہے یا نہیں ہے اور اگر نہیں ہے تو اس سے اقبال کا نقصان کتنا ہوا ہے۔ میں یہی سمجھتا ہوں کہ آج کے زمانے کے لحاظ سے دل کو چھو لینے والی بات اقبال کے یہاں کم ملے گی۔ ممکن ہے سنہ بیس یا تیس میں جب بڑا انقلابی اور حریت پسندی کا ماحول تھا تو ان کے کلام میں یہ صفت رہی ہو کہ وہ لوگوں کے دلوں کو گرما دے اور ان کو میدان میں لے آئے۔ لیکن آج جوان کے یہاں **strong affirmation** ہے وہ کچھ ہم کو گویا متاثر نہیں کرتا۔ چونکہ دنیا اتنی منتشر اور تہہ و بالا ہو چکی ہے اور ہم لوگوں کے آدرش اور آئیڈیل اتنے شکستہ اور مجروح ہو چکے ہیں کہ اب اقبال کے یہاں جو **self assurance** ہے وہ ذرا کھٹکتی ہے، اور اگر علمی مذاق نہ ہو تو اور بھی کھٹکے گی۔ لیکن پھر بھی اس شاعر کی جو فکر کی جولانی ہے وہ متاثر کیے بغیر نہیں رہتی۔ ''کہتے ہیں کبھی گوشت نہ کھاتا تھا معرّی''، اب ابوالعلا معرّی کے بارے میں تین صفحے لکھ دیجیے، کچھ بھی پلے نہیں پڑے گا اس لیے کہ جہاں لے جا کے ختم کیا ہے اس نے ''ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات'' اب یہ ایک فکری معاملہ ہے۔ آدمی اگر علمی اور فکری ذہن رکھتا ہے تب تو اس نظم کو بہت پسند کرے گا اور **enjoy** کرے گا۔ اور وہ ذہن اگر نہیں ہے تو۔۔۔ اچھا ہم لوگوں کی نسل کے مقابلے میں اگر آپ دیکھیں، جیسا کہ نیّر صاحب نے کہا کہ بارہ پندرہ برس کی عمر میں پڑھنا شروع کیا، پلّے تو نہیں پڑ رہا ہے لیکن۔۔۔

عرفان: ہاں، مرعوب ہو رہے ہیں اور متاثر ہو رہے ہیں۔۔۔

فاروقی: ۔۔۔ کہ کیا چیز ہے بھئی! جھوم رہے ہیں اُس پر۔ لیکن آج، مثلاً اپنے بچوں کو اقبال پڑھاتے وقت میں نے محسوس کیا مجھ سے پوچھتی تھیں لڑکیاں کہ صاحب ٹھیک ہے، لیکن

بات کچھ بن نہیں رہی ہے، تو وہ اسی وجہ سے کہ جس طرح کا تیقن اور جس طرح کا بلند آہنگ دعویٰ اقبال کے یہاں ملتا ہے وہ موجودہ ذہن کو متاثر نہیں کرتا۔ یہ میں سمجھتا ہوں۔

عرفان: فاروقی صاحب، آپ نے یہاں دو بہت اہم نکتے اٹھائے۔ ایک تو اقبال کی شاعری کی۔۔۔ اگر میں اس کو تاثیر کہوں تو انگیز کر لیجیے۔

فاروقی: ہاں ہاں، تاثیر

عرفان: کہ دل کو چھوتی نہیں ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں اس وقت ہمارے اُس مسئلے، 'تفہیم اقبال' سے اس کا سیدھا سروکار نہیں ہے جس سے ہم کہنا چاہیے جنگ لڑ رہے ہیں۔ یہ اس لیے کہ۔۔۔

فاروقی: ۔۔۔۔ سروکار تو صاحب، خیر بعد میں عرض کروں گا۔ آپ کہہ لیجیے۔

عرفان: تو اس کو تھوڑی دیر کے لیے ملتوی رکھتے ہیں کہ تاثیر اور اس کا معاملہ کیا ہے۔ لیکن یہ بات طے ہوگئی کہ اقبال کے سلسلے میں محض مطلب شناسی سے کام نہیں بنتا۔ جب تک آپ اُس کی شعری فکر کی تہ تک نہ پہنچیں، اور اس تک پہنچنے کے لیے جیسا کہ ہمارے نیّر صاحب نے فرمایا، صرف لغات سے یا اور فرہنگوں سے، بلکہ قاموس سے بھی کام نہیں چلتا۔ اقبال کے حوالوں کو بہرحال **decode** کرنا ہے، اس کے بغیر اقبال فہمی کے سلسلے میں قدم آگے نہیں بڑھا سکتے۔ اس کے علاوہ آپ کو اُس پورے عصر کی تاریخ کو سمجھنا ہوگا۔

فاروقی: یہ بات صحیح ہے۔ اس میں کچھ باتیں ایسی ہیں جو میں اگلی نشست میں عرض کروں گا جہاں مجھے کچھ اختلاف بھی ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ فکری تاریخ اور خود اقبال کی ذہنی تاریخ سے واقفیت کے بغیر اقبال کا کلام خاصا مشکل معلوم ہوگا، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ اس کے دروازے بند نظر آئیں گے۔

عرفان: جی ہاں درست ہے۔ شکریہ

دوسری نشست

عرفان صدیقی: پچھلی گفتگو میں فاروقی صاحب، آپ نے یہ اہم نکتہ اٹھایا تھا کہ آج کے ماحول میں جب ہم اقبال کی شاعری پڑھتے ہیں تو بہت سی جگہوں پر اس کی تاثیر پہلے کی طرح دل پر قائم نہیں ہوتی۔ اب میں چاہتا ہوں کہ یہ بات یہاں صاف ہو جائے کہ کسی شعر کی تاثیر کا اُس شعر کی تفہیم سے کتنا تعلق۔۔۔۔

شمس الرحمٰن فاروقی: ہاں، یہ تو اتنا عمدہ سوال اٹھا ہے اس وقت کہ میرے خیال میں نیّر صاحب بھی اس کی داد دیں گے۔

نیّر مسعود: یقیناً

فاروقی: میرا خیال یہ ہے کہ شعر کو سمجھنے کے لیے اس سے متاثر ہونا ضروری ہے۔ جب تک شعر کی تاثیر آپ کے ذہن پر مرتب نہیں ہوگی۔ تب تک آپ اس کی تہیں کھولنے سے قاصر رہیں گے، اس لیے کہ تاثیر کے بغیر اس کی شکل یہ ہو جائے کہ گویا کوئی معما ہے۔ آپ دماغ لگاتے رہیے پسینا ٹپکاتے رہیے، وہ آپ کے ذہن میں شعر کی سطح پر جلوہ گر نہیں ہوگا۔ رچرڈس نے بہت مزے کی بات کی تھی کہ کسی نظم کے معنی بیان کرنا اس کو سمجھنے کا طریقہ نہیں بلکہ یہ خود نظم ہے۔ اس لیے میں نے عرض کیا کہ جب تک شعر آپ پر اثر نہ کرے، آپ کو برانگیختہ نہ کرے کہ اس کو سمجھنے کے لیے کچھ زحمت کریں کوشش کریں، اُس وقت تک۔۔۔۔ میں نے پچھلی گفتگو میں عرض کیا کہ اقبال کو **exploit** بہت کیا گیا۔ کوئی کہتا ہے اقبال فلسفی، کوئی کہتا ہے اقبال اسلامی مفکر۔ مگر اقبال کا بہت سا ایسا کلام ہے جس میں تاثیر ہی تاثیر ہے۔ معنی اور تصور کو جانے دیجیے، خود ''مسجد قرطبہ'' کو لے لیجیے۔ اب بلاوجہ کے اس میں فلسفے چھانٹے جا رہے ہیں کہ صاحب یہ وہ سا ٹائم ہے اور **real** ٹائم ہے، اور فلانا ٹائم ہے۔ مگر وہاں تو یہ ہے کہ دو مرتبہ آپ پہلا مصرع پڑھ دیجیے: ''سلسلہ روز و شب نقش گرِ حادثات'' رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں ا۔ یہ ضروری ہے کہ اقبال کے کلام کے اس پہلو۔۔۔ یہ جو اس کا آہنگ ہے، خوب صورتی ہے، بہاؤ ہے، اس کی روشنی میں دیکھیں کہ یہ شعر اچھا ہے کہ نہیں اور اس کے کیا معنی نکل سکتے ہیں۔ ایک واقعہ مجھے یاد آتا ہے کہ ایک بار اقبال نے صبح اٹھ کر کہا کہ بھئی رات کو میں نے خواب میں ایک شعر کہا ہے اور معنی اس کے واضح نہیں ہو رہے ہیں۔ لوگوں نے کہا کہ حضرت یہ کیا بات ہوئی، ذرا فرمائیں۔ تو انہوں نے شعر پڑھا کہ ''دوزخ کے کسی طاق میں افسردہ پڑی ہے۔ خاکستر اسکندر و چنگیز و ہلاکو'' اب میں نے جب یہ واقعہ پڑھا، اُس وقت میری عمر کم تھی تو میں نے کہا بھئی اس میں کیا ہے۔ اس میں تو کوئی بات ہی نظر نہیں آ رہی جو مشکل ہو۔ لیکن جب آپ غور کیجیے تو پھر مشکل بھی نظر آتی ہے کہ دوزخ کے کسی طاق میں۔۔۔ اور ان تینوں کو خاص کر لایا جانا۔ تو اب ظاہر ہے کہ اس میں تاریخی علم بھی ضروری ہے، تاریخی شعور بھی ضروری ہے، لیکن اس علم اور شعور کے بغیر بھی شعر میں ایک تاثیر موجود ہے جو آپ کو فوراً گرفتار کر لیتی ہے۔ تو میرا خیال ہے کہ اس پہلو پر بھی ہم ذرا زور دیں کہ آجکل تفہیم اقبال میں جو ناکامی ہو رہی ہے اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہے کہ ہم اقبال شاعر کی جگہ اقبال فلسفی

اور محقق اور مفکر پر توجہ کرتے ہیں۔

نیّر: فاروقی صاحب، جیسا کہ آپ نے کہا۔ اقبال کی تفہیم میں یہ چیز حائل ہوتی ہے کہ ہم اُن کو شاعر کم، مفکر زیادہ سمجھتے ہیں۔ چلیے بہت انصاف کریں گے تو برابر کا شاعر اور مفکر مان لیں گے۔ کم اور زیادہ کی ناپ تول سے قطع نظر، دراصل وہ بہ یک وقت شاعر بھی تھے اور مفکر بھی تھے۔ ان کے شعر کی تفہیم میں ہم کو بھی گویا سوئچ آن اور آف کرنا پڑتے ہیں۔ کبھی یہ سمجھ کر کہ کوئی مفکرانہ، دانش ورانہ بات کہی گئی ہے ہم ان کے شعر کا مطلب دوسری طرح سوچتے ہیں۔ اگر وہ ہمارے جذبات کو مہمیز کر رہا ہے تو اسے خالص شاعری سمجھ کر دوسری طرح سوچتے ہیں۔ اقبال کا یہ گویا مخصوص انداز ہے کہ وہ ان دونوں چیزوں کو عجیب طرح سے ملا دیتے ہیں۔ مثلاً بات شروع کریں گے۔ وہ تفکر اور فلسفے سے، ''میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیرِ امم کیا ہے''، اب ہم تیار ہو کر بیٹھتے ہیں کہ کچھ فلسفۂ زوالِ اقوام۔۔۔۔

عرفان: ۔۔۔۔ بیان کیا جائے گا۔

نیّر: ۔۔۔۔ مگر وہاں آتا ہے ''شمشیر و سناں اوّل، طاؤس و رباب آخر''۔ تو فوراً ہم کو سوئچ اوور کرنا پڑتا ہے۔ یا ''اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے''، اس کے دوسرے مصرعے میں ہم تیموریوں وغیرہ کا ذکر سننے کے لیے دماغ کو تیار کرتے ہیں، مگر مصرع کہتا ہے ''کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا''۔ اور وہ جو اُن کی نظم ہے، فاروقی صاحب، میں تو اسی کو ان کا شاہکار سمجھتا ہوں، ''ذوق و شوق''

فاروقی: بالکل صحیح ہے۔

نیّر: اس میں یہ چیز بہت نمایاں ہے۔ ''لوح بھی تو قلم بھی تو تیرا وجود الکتاب''، یہ بالکل دوسرا وہی تفکر والا آہنگ ہے، لیکن دوسرا مصرع ہے ''گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب''

عرفان: واہ کیا کہنے۔

نیّر مسعود: تو یہ جو اقبال کی ایک بہت بڑی قوت ہے، یہی ان کے بیچارے مفسّروں کو کم زور کر دیتی ہے کہ دونوں مصرعوں کو ایک ہی ڈور میں کس طرح پرویا جائے، کہ اس شعر کی عظمت آخر ہم دونوں میں سے کس کی بنا پر سمجھیں گے۔ بالعموم ہم یہ کرتے ہیں کہ کبھی تو اس پہلو پر زور دے رہے ہیں کہ صاحب یہ بہت عمدہ مفکرانہ شعر ہے اور اس کے شاعرانہ فنی پہلو کو فراموش کر گئے اور کبھی۔۔۔۔ اس سلسلے میں، عرفان صاحب، کچھ دیر بعد میں شاید بھول جاؤں تو آپ یاد رکھیے گا، اس پر ذرا غور کرنا ہے، ان دونوں پہلوؤں کے سلسلے میں کہ

خالص فن کار کی حیثیت سے اقبال۔۔۔۔۔

فاروقی: ایک مشکل، میرا خیال ہے، اقبال کو سمجھنے میں یہ بھی ہے کہ وہ جو بہر حال ان کی بہت بڑی اور مشہور نظمیں ہیں، بڑی بھی اور مشہور بھی، مثلاً ذوق وشوق'' کا ذکر آیا، یا مثلاً ''مسجد قرطبہ'' اور جو نظمیں میرے خیال میں اتنی بڑی نہیں ہیں لیکن مشہور بہت ہوئیں مثلاً ''طلوع اسلام'' یا وہ نظمیں جن کے بعض بعض حصے واقعی بڑی شاعری ہیں، جیسے ''خضر راہ ''، بعض جو اتنی اچھی نہیں ہیں، مثلاً ''شمع و شاعر'' کو آپ کہہ سکتے ہیں کہ بیچ کی نظم ہے۔ بہت اچھی ہے مگر اقبال کے بہترین کلام کے برابر نہیں ہے، ان سب نظموں میں ایک بات مجھ کو شروع ہی سے محسوس ہوتی رہی ہے کہ اس شخص کو کسی بھی غیر معمولی یا غیر فطری یا مافوق الفطرِی طاقت یا قوت یا ہستی سے خطاب کرنے ہیں جھجک نہیں ہوتی، وہ برابر کی گفتگو ان سے کرتا ہے، چاہے وہ شمع سے شاعر کی بات ہو رہی ہو، چاہے وہ ساحلِ دریا پر خضر سے، چاہے۔۔۔۔۔

عرفان: ۔۔۔ بندہ خدا سے بات کر رہا ہو۔۔۔

فاروقی: ۔۔۔ جو بھی ہو، اس کی وجہ میرے خیال میں یہ ہے کہ انیسویں صدی میں لوگوں کے ذہن میں شاعر کے متعلق ایک رومانی قسم کا تصور تھا کہ شاعر عام انسانوں کی فطرت سے بھی اور مافوق الفطرت چیزوں سے بھی ہم آہنگ ہیں اور ان سب میں ایک ہی قسم کی روح دوڑ رہی ہے جس کو برگساں نے **vitality of life** کہا تھا۔ یہ پھر وہی فکری معاملہ ہے کہ اس شخص کو جو کوئی 'حجاب نہیں ہے، خفتگانِ خاک سے بھی بات کر لیتا ہے جگنو سے بھی بات کر لیتا ہے اور پہاڑ سے بھی، اور پیغمبرؐ سے بھی بات کر لیتا ہے، وہ اسی لیے کہ اس کے یہاں یہ سب ایک نظامِ حیات ہے جس میں ایک ہی روح دوڑ رہی ہے۔ اور یہی چیز اقبال کے کلام کو ایک غیر معمولی وسعت اور پہنائی بھی عطا کرتی ہے اور ان کے مقابلے میں جو لوگ سامنے آتے ہیں ان میں کسی کے یہاں وہ وسعت اور پہنائی نہیں ہے۔ اگر اس بات کو ہم فراموش کر جائیں تو پھر ہمیں مشکل ہو جائے گی کہ ان کی بڑائی کو کس طرح ظاہر کریں۔

عرفان: صحیح ہے، فاروقی صاحب، کہ جو وسعت اور پہنائی اور گہرائی اقبال کے یہاں ہے، اس کا انداز اپنے معاصروں سے تو الگ ہے ہی، پہلے والے شاعروں سے بھی الگ ہے۔ مثلاً آپ نے تخاطب کا معاملہ لیا۔ تو تخاطب تو ہماری شاعری میں بہت ملتا ہے، خدا سے بھی اور دوسروں سے بھی، لیکن اقبال کے یہاں دو فطری عناصر جس طرح بات کرتے ہیں اُن کی شناخت اور ایک دوسرے سے گفتگو کا انداز ہی بالکل مختلف ہے۔ ظاہر ہے اس کی جڑیں بھی تفہیم سے اس طرح ملتی ہیں کہ ہمیں تلاش کرنا پڑے گا کہ اقبال نے ان عناصر

میں گفتگو کا یہ approach کیوں اختیار کیا۔ تو یہ تفہیم کا مسئلہ بنتا ہے۔ میں ایک بات اور عرض کرنا چاہتا ہوں جو میرے ذہن میں نیّر مسعود صاحب کی گفتگو سے آئی۔ انہوں نے بڑی اچھی بات کہی کہ اقبال نے ایک بڑا کام، یعنی شعری اور تخلیقی اعتبار سے بڑا کام، یہ کیا کہ بہت سے مروجہ الفاظ اور اصطلاحات بدل دیے، بلکہ کہیں کہیں الٹ دیے۔ مثلاً عشق ان کی بڑی زبردست اور بنیادی اور کلیدی اصطلاح ہے لیکن یہ عشق بالکل وہ عشق نہیں ہے جو اس سے پہلے تھا۔ بلکہ اُن پر اعتراض بھی ہوا کہ صاحب، آپ عشق کو اتنی فوقیت دیتے ہیں اور قرآنی فکر سے اس کا رشتہ جوڑتے ہیں۔ قرآن میں تو عشق۔۔۔ یعنی یہ لفظ ہی۔۔۔

فاروقی: ہاں، لفظ ہی استعمال نہیں ہوا۔

عرفان: نہیں ہوا ہے، اور مذہبی فکر میں عشق خاصا مبغوض اور مردود لفظ ہے۔ یہ بڑی اہم بات ہے۔ یعنی عشق کو آپ پرانے حوالے سے پڑھنا چاہیں گے تو اقبال آپ پر کھلیں گے ہی نہیں۔ یہ بات درست کہی نیّر مسعود صاحب نے کہ اقبال نے بہت سے شعری کلیدی الفاظ استعمال کیے لیکن ان میں ایک دوسرا رنگ اور دوسری معنویت بھر دی ہے۔ اس معنویت کی تلاش اقبال کی تفہیم کے سلسلے میں ایک بڑا کام ہے اور اسی وجہ سے میرے خیال میں، فاروقی صاحب کیا آپ محسوس نہیں کرتے کہ اقبال کا آہنگ بھی خاصا مختلف نظر آتا ہے۔ اقبال کی غزلیں جو ہیں وہ اپنی پیش رو غزلوں سے بالکل الگ ہیں، اور نظمیں بھی، آپ فرما رہے تھے، نیّر مسعود صاحب نے بھی ''ذوق وشوق'' کا حوالہ دیا، اس طرح کی نظمیں آپ کو اُس وقت بھی نہیں ملتی تھیں، آج بھی نہیں ملتیں۔ تو آہنگ کا یہ فرق جو ہے، اقبال کی شعری سچائی کو دریافت کرنے کے لیے اس کی بھی تلاش کرنا چاہیے کہ یہ فرق کیا ہے اس کی وجہ سے ان کا شعر کیوں مختلف اور بہتر ہو جاتا ہے؟

فاروقی: عرفان صاحب، غزل کو تو میرے خیال میں اگلی نشست کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔ اس لیے کہ غزل کے بارے میں بہت کچھ کہنا ہے، اور یہ کہ اقبال کی غزل غزل ہے بھی کہ نہیں۔ یہ ایک بڑا مسئلہ ہے۔ ابھی تو وہ پہلی والی بات سامنے رکھتے ہیں کہ جیسا کہ نیّر صاحب نے کہا یہ عشق وغیرہ، دسیوں لفظ ایسے ہیں۔ اس لیے ایک بات جو ہم اکثر بھول جاتے ہیں وہ یہ ہے کہ اگرچہ اقبال کا جو عام لہجہ ہے وہ کلاسیکی شعرا سے ملتا جُلتا ہے لیکن ایک معاملے میں وہ بالکل جدید ہیں اور گویا پہلے بڑے شاعر ہیں جنھوں نے یہ کام کیا ہے کہ الفاظ کو اپنے معنی میں استعمال کیا ہے۔ اب اس پہلو پر لوگ غور نہیں کرتے کہ اقبال نے ان کو جب اپنے معنی دیے ہیں تو جب تک ہم اقبال کے اپنے ذہن سے ان معنی کو نہ نکالیں،

بات نہیں بنتی۔ جب وہ کہتے ہیں، ''اک دانش نورانی، اک دانش برہانی''، تو غور کرنا پڑتا ہے کہ بھئی دانش تو دونوں جگہ کہہ رہے ہیں پھر یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ نورانی الگ ہوتی ہے، برہانی الگ ہوتی ہے۔ تو وہ کیا ہے، صرف تعقل اور تصوف ہے، یا کچھ اس سے بڑھ کر ہے یا کم ہے۔ مجھے اپنی بات پھر یاد آتی ہے، جیسے، مان لیجیے کہ ''لالۂ صحرائی'' ہے۔ جب میں نے پہلی بار اس کو پڑھا اور اس وقت سے لے کر اب تک ہزاروں بار پڑھ چکا ہوں اور کتنی بار بہ آواز بلند پڑھ چکا ہوں۔۔۔۔

نیّر: اس میں کوئی تلمیحی حوالہ نہیں ہے۔ وہ خالص۔۔۔

فاروقی: کوئی تلمیحی حوالہ نہیں ہے، لیکن اسی لیے وہ نظم اپنی جگہ پر اس قدر مکمل بھی ہے اور مشکل بھی کہ اُس میں تمام الفاظ کو اقبال نے خود اپنے معنی میں استعمال کیا ہے۔ مثلاً ''یہ گنبد مینائی یہ عالم تنہائی۔ مجھ کو تو ڈراتی ہے اس دشت کی پنہائی''۔ اب ظاہر ہے کہ یہ گنبد مینائی آسمان ہے بھی اور نہیں بھی، اور یہ دشت جو ہے، یہ دشتِ حیات ہے بھی اور نہیں بھی ہے۔ اس پر مجھے خوف ہے کہ بہت کم لوگوں نے غور کیا ہے۔ لوگ یہی کہتے رہے ہیں کہ عشق ان کے یہاں علامت ہے اور شاہین ان کے یہاں۔۔۔ لیکن بنیادی بات یہ ہے کہ انہوں نے شاعری کے جو روزمرہ کے الفاظ ہیں اُن کو اپنے معنی میں استعمال کیا ہے، اسی لیے ان کی نظم مشکل معلوم ہوتی ہے۔

نیّر: آپ نے بہت صحیح بات کہی، فاروقی صاحب۔ اسی ''لالۂ صحرائی'' میں جو شعر ہے۔ اس کا مطلب اب تک پوری طرح سمجھ میں نہیں آیا ہے لیکن بہت زبردست شعر معلوم ہوتا ہے اور ابھی جیسا آپ نے کہا معلوم ہوتا ہے اس کا ہر لفظ اقبال کسی الگ معنی میں، ذاتی معنی میں استعمال کر رہے ہیں۔ کہتے ہیں ''اس موج کے ماتم میں روتی ہے بھنور کی آنکھ دریا سے اٹھی لیکن ساحل سے نہ ٹکرائی''۔ یہ بالکل عام الفاظ ہیں۔

عرفان: بہ ظاہر بالکل کلاسیکی رنگ کا شعر معلوم ہوتا ہے۔

نیّر: جی ہاں۔ کوئی بھی تو معنی خیز لفظ نہیں، حتیٰ کہ بھنور کے لیے ''گرداب'' بھی نہیں استعمال کیا جو نسبتہً معنی خیز معلوم ہوتا ہے۔ تو اس پر بھی زرا گفتگو ہونا چاہیے۔ اقبال کا استعمالِ الفاظ۔

عرفان: درست ہے۔ اس گفتگو میں یہ بالکل طے شدہ بات لگی کہ اقبال نے تمام شعری نظام میں جو تبدیلیاں کیں ان میں ایک بڑی تبدیلی الفاظ کو۔۔۔

فاروقی: ۔۔۔۔اپنے معنی میں استعمال کرنا۔۔۔

عرفان: ۔۔۔۔اپنے طور پر برتنا ہے، پہلے وہ کسی بھی انداز میں استعمال ہوتے رہے ہوں۔

نیّر: اچھا، اسی سے عرفان صاحب یہ بھی مان لینا چاہیے کہ اگر ایسا کوئی شاعر ہے جو لفظوں کو اپنے طور پر استعمال کر سکے تو زبان کا اس سے بڑا ماہر تو کوئی۔۔۔۔

فاروقی: ۔۔۔۔قطعی، بے شک۔

عرفان: یقیناً وہ زبان کے بہت بڑے ماہر تھے، اس میں تو کوئی شک ہی نہیں۔ زبان سے ان کا بڑا اجتہادی رشتہ تھا، بلکہ کہیں کہیں تو بڑا باغیانہ رشتہ ہو جاتا ہے۔

نیّر: اور اقبال کو بڑا شاعر ماننے کا سوال ہی نہیں جب تک ہم پہلے یہ نہ تسلیم کر لیں کہ وہ زبان کے بڑے ماہر تھے۔ اگر ہم اُن کو سب سے بڑا شاعر مان رہے ہیں تو انہیں سب سے بڑا ماہر زبان بھی مان رہے ہیں۔

فاروقی: ہاں، ماننا پڑے گا۔

نیّر: اور یہ حقیقت بھی تھی۔ ایک مثال بس، اس گفتگو کا وقت ختم ہو رہا ہے۔ فاروقی صاحب، وہ جو سنائی کی زمین میں قصیدہ ہے۔۔۔

فاروقی: ہاں ''سما سکتا نہیں پہنائے فطرت میں مرا سودا''

نیّر: اسی میں، ''یہی شیخ حرم ہے جو چرا کر بیچ کھاتا ہے''۔۔۔۔چُرا کر بیچ کھانا، کسی اور شاعر کی ہمت نہ پڑتی کہ اس شان کے قصیدے میں ایسا عامیانہ محاورہ استعمال کرے۔

فاروقی: اور وہ بھی کن چیزوں کے سلسلے میں۔

عرفان: کن چیزوں کے سلسلے میں، واقعی۔۔۔۔

فاروقی: ۔۔۔۔گلیم بوذر و دلق اویس و۔۔۔۔۔

عرفان: ۔۔۔۔چادر زہراؑ!

نیّر: اس فعل کا گھٹیا پن اور چھچھورا پن ظاہر کرنے کے لیے ایسا ہی عامیانہ محاورہ چاہیے تھا۔

فاروقی: یہ تو میر ہی کر سکتے تھے کہ ''بس ان نمازیوں کو خانہ ساز دیں جانو کہ ایک اینٹ کی خاطر یہ ڈھاتے ہیں گے مسیت'' اُسی نے کہا صاحب، اور اُس کے بعد پھر اقبال نے کہا اور کوئی

نہیں کہہ سکتا۔

عرفان: درست ہے۔شکریہ۔

تیسری نشست

عرفان صدیقی: پچھلی گفتگو کا سلسلہ اس پر ختم ہوا تھا کہ اقبال نے کس انداز میں پرانے شعری الفاظ اور اصطلاحوں کو اپنے طور پر ایک نئی معنویت دی ہے اور تقریباً بالکل معنی بدل کے استعمال کیا ہے۔ایک شعر کے حوالے سے میں اس بات کو تھوڑا سا آگے بڑھانا چاہتا ہوں۔ یہ شعر خاص طور پر اس لیے پڑھ رہا ہوں کہ اقبال کی تفہیم سے تعلق رکھنے والے دونوں مسئلے اس میں سامنے آتے ہیں۔یعنی تاریخی اور مذہبی حوالے اور الفاظ کی نئی معنویت۔شعر ہے ان کا کہ ''ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزول کتاب گرہ کُشا ہے نہ رازی نہ صاحب کشاف''۔ٹھیک ہے معلوم ہے کہ انہوں نے قرآن کی دو تفسیروں کا حوالہ دیا ہے۔لیکن میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ یہاں اگر آپ ''کتاب کو صرف قرآن کے معنوں میں سمجھیں گے تو شاید پورا شعر منکشف نہیں ہوگا۔''ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزول کتاب'' ظاہر ہے کہ قرآن آپ پر نہیں اتر سکتا۔لگتا ہے کہ اس میں کچھ اور بات کہی گئی ہے۔ یہاں ''کتاب'' کا جو لفظ ہے وہ کسی وسیع تر معنویت کا حامل ہے اور اس کی تلاش کی جانی چاہیے۔

نیّر مسعود: اس پر،عرفان صاحب یاد آ گیا۔ایک بہت ذہین نوجوان عالم دین سے ایک مرتبہ گفتگو ہو رہی تھی۔موضوع یہی نزولِ قرآن تھا۔انہوں نے بہت عمدہ بات کہی کہ اکثر جب میں کلام پاک کی تلاوت کرتا ہوں تو مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ میں دو کتابیں پڑھ رہا ہوں۔

شمس الرحمٰن فاروقی: واہ!

نیّر: ایک تو وہ جو آنحضرتؐ پر نازل ہوئی،اور ایک وہ جو خاص مجھ پر نازل ہو رہی ہے۔تو یہ غالباً بلکہ یقیناً اقبال کا بھی تجربہ ہوگا۔ان کے یہاں کتاب صرف قرآن نہیں بلکہ کچھ کتاب کائناتی قسم کی چیز بھی ہے۔

فاروقی: ہاں۔اس لیے کہ اس اصطلاح کو تو انہوں نے اور جگہ بھی برتا ہے:''خدا تجھے کسی طوفان سے آشنا کر دے کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں۔تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو کتاب خواں ہے مگر صاحب کتاب نہیں''۔جب میں نے اس کو پہلی بار پڑھا تو سوچا یہ کیا بات ہے؟ کتاب خواں ہے،مگر صاحب کتاب نہیں؟ صاحب کتاب تو ہم

سب لوگ ہیں۔تو جیسا کہ عرفان صاحب نے کہا کہ یہاں پر کتاب کی معنویت کو بدل کے دیکھنا ہوگا۔

نیّر: جی ہاں۔ ''کہہ ڈالے قلندر نے اسرار۔۔۔۔

فاروقی: ۔۔۔۔کتاب آخر'' بالکل۔پھر پیغمبرؐ کے لیے خاص کر''الکتاب'' کہتا ہے۔تو ظاہر بات ہے، اب اس طرح کے الفاظ چونکہ شاعری میں پہلے سے موجود تھے، پوری زبان ہی میں مستعمل ہیں، کتاب ہے، قلم ہے، لوح ہے۔تو اگر پڑھنے والا ان کو غور سے نہ پڑھے اور ان پر نگاہ نہ رکھے گا تو ممکن ہے کہ وہ ان سے یوں ہی گذر جائے۔

عرفان: یا یہ کہ گم راہ ہو جائے۔اگر مروجہ معنوں میں لفظ کو سمجھ لیا تو مفہوم شعر تک رسائی تو درکنار، وہ بالکل دوسری سمت میں چلنا شروع کر دے گا۔

فاروقی: ہاں ہاں یہ بھی ہوسکتا ہے اور یہیں سے وہ بات نکلتی ہے جو پچھلی گفتگو میں آئی کہ جو اُن کا تخاطب ہے، مثلاً تخاطب جو اللہ سے ہے، یا جو تخاطب پیغمبرؐ سے ہے، اگر ہم یہ سمجھیں کہ یہ وہی تخاطب ہے جو عام طور پر دو شخصیتوں یا ہستیوں میں ہوتا ہے تو مشکل پڑ جائے گی۔ مثلاً

اگر کج رو ہیں انجم آسماں تیرا ہے، یا میرا
مجھے فکر جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا

اب اس میں اگر ایک طرح کا چڑ چڑا پن سمجھ لیا جائے کہ صاحب، دیکھیے یہ تو محض لڑکپن کا سا انداز ہے۔اتنا ہی رکھا جائے۔تو ظاہر ہے کہ ہم اس کی اصلی معنویت سے محروم رہ جائیں گے، کیونکہ اقبال کے کلام کی ایک طرح سے بنیادی لے، یا زیریں لہر یہی سوال ہیں کہ کائنات میں انسان کا رول کیا ہے اور کائنات سے انسان کا رشتہ کیا ہے۔اس کی ان کو بہت فکر ہے۔اور وہ اس کے بارے میں بہت سوچتے ہیں اور بہت پوچھتے رہتے ہیں۔خود سے بھی پوچھتے ہیں، اللہ سے بھی پوچھتے ہیں، تمام لوگوں سے پوچھتے ہیں، خود کائنات سے سوال کرتے ہیں، اور غالباً پہلی بار اتنا تجسس، اتنا سوال اور استفسار اردو شاعری میں نظر آتا ہے کیونکہ پہلے زمانے میں تو گویا لوگوں کو ٹھیک ٹھیک معلوم ہی تھا کہ بھئی انسان کی کیا وقعت ہے، کائنات میں اس کی کیا حیثیت ہے اور اللہ کہاں پر ہے، اور کائنات کہاں پر ہے، اور ہم کہاں پر ہیں۔ان تمام رشتوں کو بھی ایک طرح سے upset کرنا۔۔۔

عرفان: ہاں جو roles پہلے defined تھے ان سب کو بدل دینا۔۔۔۔

فاروقی: ۔۔۔۔یا ان کو کم سے کم question کرنا۔

نیّر: اب دیکھئے یہ جو گفتگو اس وقت ہو رہی ہے اس کا تعلق اقبال کی شاعری کے موضوع اور مشتملات اور نفس مضمون سے ہے، خالصتہً ان کے فن یا شعری حرفت سے نہیں ہے۔ ایک دل چسپ یا افسوس ناک بات کہہ لیجیے؛ فاروقی صاحب تو شاید مشتعل ہو جائیں۔ میرا خیال ہے عرفان صاحب، آپ سے گفتگو کی جائے۔ اقبال کی شاعرانہ حیثیت کے علاوہ ایک دانش ورانہ، مدبرانہ اور سیاسی حیثیت بھی تھی اور ایک معمارِ ملک بھی مانے جاتے ہیں۔ تو فاروقی۔۔۔۔نہیں فاروقی صاحب سے بات نہیں کر رہا ہوں۔

عرفان: کوئی مضائقہ نہیں، اس لیے کہ بات تو ان سے کی ہی جائے گی۔

نیّر: ان کو غصہ آئے گا، اور پھر۔۔۔۔

عرفان: نہیں تو ان کو تھوڑا سا مشتعل کیا جائے گا۔

نیّر: خاص طور پر ہندوستان کے نقاد، اور ان میں فاروقی صاحب یقیناً شامل ہیں۔ اگر اقبال کے فنی محاسن پر گفتگو کو مرکوز رکھتے ہیں تو سمجھا جاتا ہے کہ گویا ایک منصوبے کے تحت ایسا کیا جا رہا ہے۔ اور اقبال کی جو اصل عظمت تھی، فکری عظمت، اس کو چھپانے کے لیے اس پر زور دیا جا رہا ہے کہ صاحب وہ ''شاعر بہت اچھے تھے، ''شاعر'' بہت اچھے تھے اور یہ جو فاروقی صاحب کہتے ہیں کہ اُن کے موضوعات سے ہم کو مطلب نہیں ہے، اور فلسفی وہ بہت غیر معمولی قسم کے نہیں تھے اور اُن سے بہتر فلسفی تو مثلاً رسل تھا، یہ سب ایک سازش ہے کہ اقبال کی جو اصل عظمت ہے اس کو چھپا کے بس یہ کہتے ہیں کہ وہ ''شاعر'' بہت عمدہ تھے، تو عمدہ شاعر تو ''داغ'' بھی تھے۔ اب اس پر غصہ ظاہر ہے آنا بھی چاہیے۔ اور ایہ احتجاج صحیح بھی نہیں ہے۔

عرفان: درست ہے، نیّر صاحب۔ یہ تو طے شدہ بات ہے کہ ہم اقبال کو اس لیے اہم سمجھ رہے ہیں کہ وہ شاعر تھے۔ اب اگر وہ شاعر تھے تو شاعر کی حیثیت سے اور شاعری کے وسیلے سے انہوں نے کن کن موضوعات کو برتا، فکر کی کون کون سی تہیں ان کے یہاں ہیں۔۔۔۔

فاروقی: ۔۔۔۔اس پر بھی ہم بات کر رہے ہیں۔

عرفان: جی ہاں، اس پر بھی ہم نے بات کی ہے، لیکن اگر وہ صرف فلسفی تھے، یا صرف دانش ور تھے، یا صرف مفکر تھے تو میں سمجھتا ہوں کہ وہ ادب کے پڑھنے والوں کا بہت زیادہ

concern نہیں رہتے۔

فاروقی: نہیں، زیادہ کیا بالکل نہیں

عرفان: وہ بہت کچھ تھے لیکن شاعر بھی تھے اور ہم شاعر اقبال ہی کو پڑھیں گے اور اس پر بات کریں گے۔

نیّر: تو اب ہماری گفتگو اسی موضوع پر ہے، یعنی اقبال بہ حیثیت فن کار۔ فاروقی صاحب نے کہیں یا تو لکھا ہے یا کسی تقریر میں کہا تھا، بہرحال لوگ اس پر بہت ۔۔۔ تقریباً اچھل پڑے تھے کہ یہ فاروقی صاحب کیا کہہ رہے ہیں کہ اقبال کے یہاں ابہام اور رعایت لفظی بھی ہے۔ یہ تو اقبال کے دامن پر گویا ایک دھبا لگایا جا رہا ہے۔ خیر، اب شاعری اور اپنے شعری اظہار کے سلسلے میں اقبال کے وہ دو فارسی شعر ہیں جن کا پڑھنا ناگزیر ہوتا ہے۔ ایک تو یہ کہ ''برہنہ حرف نہ گفتن کمال گویائی ست حدیث خلوتیاں جز بہ رمز و ایما نیست'' یعنی بہترین تکلم یا بہترین شاعری وہ ہے جس میں بات کو براہ راست نہ کہا جائے۔ دوسرا شعر وہ ہے ''دقتِ برہنہ گفتن است، من بہ کنایہ گفتہ ام خود تو بگو کجا برم ہم نفسانِ خام را'' کہ یہ تو کھل کر اور واشگاف انداز میں بات کہنے کا وقت ہے، میں کنایوں میں بات کر رہا ہوں، پھر بھلا بتاؤ میں اپنے ہم نفسوں کی کیا ہدایت کر پاؤں گا۔ یعنی وہ تو ہدایت اور رہنمائی کے مقصد کو بھی شاعرانہ اظہار پر قربان کیے ہوئے ہیں۔ اور اس پہلو سے اقبال کا جائزہ نہ لینا تو واقعی ۔۔۔۔

عرفان: ایک ظلم سا ہوگا اقبال پر تو اب شاعر اقبال کے مطالعے میں، فاروقی صاحب ان کی غزلوں کو ہم دیکھتے ہیں کہ format کے اعتبار سے اپنی شکل اور ہیئت کے اعتبار سے وہ غزلیں ہیں بھی اور بعض حیثیتوں سے شاید نہیں بھی ہیں۔ یہ ایک خاصی تکنیکی بحث ہو جائے گی، لہٰذا تھوڑی دیر کے لیے یہ مانتے ہوئے کہ بال جبریل میں جو چیزیں ہیں وہ بیشتر غزلیں ہیں ہم دیکھتے ہیں کہ ان میں اقبال کا جو ڈکشن ہے وہ دوسرے شاعروں کی غزلوں سے بہت مختلف ہے۔ مثال کے طور پر ایک شعر پڑھتا ہوں: ''یہ زیرِ کہن کیا ہے، انبار خس و خاشاک مشکل ہے گذر اس میں بے نالۂ آتش ناک''۔ تو یہ نالہ وہ نالہ تو نہیں ہے جو کوئی پرانا عاشق کرتا تھا۔

فاروقی: بلکہ یہ وہ نالہ بھی نہیں جو ''شکوہ'' جواب شکوہ'' میں ہے۔

عرفان: وہ بھی نہیں ہے۔ تو یہ لگتا ہے کہ اقبال نے ان فن پاروں میں جنہیں ہم اپنی سہولت کی خاطر غزل کہہ رہے ہیں۔ ڈکشن کا اور ترسیل خیال کا ایک بالکل ہی نیا انداز اختیار کیا ہے۔ اس

سلسلے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

فاروقی: مجھے ایک تو اس سلسلے میں آپ سے اختلاف کرنا ہے کہ ''بال جبریل'' کی جن چیزوں پر وہ نمبر پڑے ہوئے ہیں، ان کو آپ غزل کہہ رہے ہیں۔ غزل تو وہ نہیں ہیں۔ ان پر شاعر نے نمبر ڈالے ہیں اور نمبروں میں وہ بھی شامل ہے۔ ''سما سکتا نہیں پہنائے فطرت میں مرا سودا''

عرفان: نہیں میں سب کو نہیں کہہ رہا ہوں۔

فاروقی: تو پھر اس میں تو کچھ بچتا ہی نہیں ہے۔ جن چیزوں پر غزل کا عنوان ڈالا گیا ہے وہ تو ضرب کلیم میں ہیں اور وہ اس طرح کی چیزیں ہیں، ''دریا میں موتی اے موج بے باک ساحل کی سوغات خار و خس و خاک''۔ بال جبریل میں تمام نمبر لگے ہیں اور ان میں ایک نمبر ایسا ہے، پانچواں یا چھٹا جس میں چار شعر کسی اور زمین [مستعار کا، ناپائدار کا] اور ایک شعر، آخری کسی اور ردیف قافیے [کھٹک لازوال ہو، کسک لازوال ہو] میں ہے۔

عرفان: وہ تو ظاہر ہے کہ غزل نہیں ہے، لیکن میں پوچھتا ہوں۔ بہت دل چسپ بحث آپ نے چھیڑی ہے۔ آیئے اسے آگے بڑھائیں۔ مثلاً ''اک دانشِ نورانی اک دانش برہانی ہے دانشِ برہانی حیرت کی فراوانی'' آپ نے پڑھا تھا۔ یہ کیا ہے۔ مطلع ہے، یا نہیں ہے؟

فاروقی: پتا نہیں، میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ کیا ہے۔

عرفان: نہیں، تو آپ اسے کیا کہیے گا؟

فاروقی: ''اس پیکر خاکی میں اک شے ہے سو وہ تیری میرے لیے مشکل ہے اس شے کی نگہبانی''۔ اب یہ وہ شعر ہے کہ اس پر سر دھُنیے آپ، آسمان چھو لیجیے۔ دیکھیے نا، ایک مطلع لگا دینے کی وجہ سے اسے غزل کہنا۔۔۔۔

نیّر: اسے قصیدہ بھی کہہ سکتے ہیں۔

عرفان: نہیں میں نے اس لیے عرض کیا تھا کہ تکنیکی اعتبار سے ہم ان کو غزل کہنے پر اس لیے مجبور ہوتے ہیں کہ ان کا **format** غزل کا سا ہے۔

فاروقی: قصیدے کا **format** کیوں نہیں مانتے ہیں اس کو آپ؟ ''ہو نقش اگر باطل، تکرار سے کیا حاصل کیا تجھ کو خوش آتی ہے آدم کی یہ ارزانی''، بالکل قصیدے کا **format** ہے۔

عرفان: نہیں، قصیدے کا format تو۔۔۔ اچھا تو مجھے یہ بتایئے، ''وہ حرف راز کہ مجھ کو سکھا گیا ہے جنوں خدا مجھے نفس جبریل دے تو کہوں'' تو صاحب اس میں ''قصیدیت'' کہاں آپ کو ملے گی؟

فاروقی: یہی تو مشکل ہے کہ اب۔۔۔۔

عرفان: یہی میں عرض کر رہا ہوں

فاروقی: میں یہی عرض کر رہا ہوں۔ کہ اقبال شاید یہ بتانا چاہتے ہیں کہ دیکھو یہ قصیدے اور غزل دونوں سے ماورا۔۔۔۔

عرفان: ۔۔۔۔کوئی چیز ہے۔ لیکن فی الحال ہم ان کو غزل کہہ لیتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ ان فن پاروں کے ڈکشن اور ترسیل خیال کے لحاظ سے آپ ان کی معنویت کو کس طرح دیکھتے ہیں، اور ان اشعار کی تفہیم کو نظموں کی تفہیم سے کس طرح مختلف پاتے ہیں؟

نیّر: ایک سوال میں بھی اس میں جوڑ دوں، فاروقی صاحب، اقبال کا کلام اپنے آہنگ کی وجہ سے فوراً پہچان میں آتا ہے، لیکن اس آہنگ کو بیان کس طرح کیا جائے؟

فاروقی: پہلے میرا خیال ہے، پہلی بات کو لیتے ہیں۔ میرا خیال ہے جس بنا پر لوگوں نے نمبروں والے کلام کو غزل کہا وہ یہ ہے کہ اس میں معنی سے زیادہ کیفیت کی فراوانی ہے اور اس کے معنی بیان کرنا مشکل بھی ہے اس لیے کہ اس میں فکر کا ویسا غلبہ نہیں ہے جیسا ہم اقبال کے ساتھ وابستہ کرتے ہیں اور یقیناً یہ ایک طرح کا کلام ہے ''محبت کی رسمیں نہ ترکی نہ تازی شہید محبت نہ کافر نہ غازی یہ جوہر اگر کارفرما نہیں ہے ''تو ہیں علم وحکمت فقط شیشہ بازی''۔ ان میں اس قدر۔۔۔۔ اس کو سرمستی کہیے، سرشاری کہیے، جو بھی کہیے، لیکن ایک ایسی کیفیت کی فراوانی ہے کہ شعر بہرحال آپ کو متاثر کرتے ہیں۔ اگر یہ کہیے کہ ان میں مثلاً قصیدے کا وہ رنگ ہے جو منوچہری کے چھوٹی بحر والے قصیدوں۔۔۔

نیّر: ہاں ''سلام'' ''علیٰ دارِاُمّ الکواعب''

فاروقی: ۔۔۔۔اس قسم کے، تو بات اس لیے نہیں بنتی کہ ''سلام علیٰ دارِامُ الکواعب'' قسم کے جو چھوٹی بحر والے قصیدے ہیں، اُن میں تغزل تو بہت ہے، لیکن ان میں آہنگ کا وہ سبک پن نہیں ہے جو اقبال کے یہاں ہے کہ۔۔۔۔

نیّر: ۔۔۔۔لفظ بہتے چلے جا رہے ہیں۔

فاروقی: جی ہاں اور یہ جو نئی نسل کے لوگ اقبال کو بہت زیادہ پسند نہیں کرتے، اگر ان سے کہا جائے کہ اس کو غزل یا قصیدہ یا نظم سمجھ کر نہ پڑھو، بس کلام سمجھ کر پڑھو تو وہ لوگ زیادہ متاثر ہوں گے، کیونکہ وہ توقعات جو ہمیں عام غزل، داغ بلکہ غالب کی بھی غزل سے ہیں وہ اس کلام سے پوری نہیں ہوتیں اور اس میں معنی بیان کرنے کے وہ مراحل نہیں ہیں جو مثلاً ''خضر راہ'' میں یا دوسری مشکل نظموں میں ہم دیکھتے ہیں، بلکہ ان کی جگہ پر ایک سرمستی ۔۔۔ اب رہ گیا یہ سوال کہ کیا یہ سرشاری اور سرمستی کی سی کیفیت اور جگہ نہیں ہے؟ تو اس کا جواب میں یہ دینا چاہتا ہوں کہ ہے بھی اور نہیں بھی ہے۔ اس لیے کہ اور جگہ پر معنی بھی کثرت سے ہیں اور یہاں معنی کم ہیں۔ مثلاً سر راس مسعود پر جو نظم انہوں نے لکھی تھی۔ اس کو پڑھیے آپ۔ پہلا بند جو ہے وہ تو مرثیہ ہے گویا، سر راس مسعود کے بارے میں، دوسرے میں بہت فکری رنگ ہے، مگر آہنگ دونوں میں بہت ہی ٹھہرا ہوا اور گمبھیر ہے۔ تو اقبال کے یہاں آہنگ کا تنوع اس طرح ہے، کہ کہیں معنی کی کثرت ہے، پھر بھی آہنگ بہت پُرشکوہ ہے، بعض جگہ معنی کی کثرت نہیں ہے لیکن آہنگ میں روانی بھی نہیں ہے اور جو یہ پوچھا جائے کہ ایسا کیوں ہے، تو صاحب اس کا جواب میرے پاس نہیں ہے۔

عرفان: اس کا جواب، فاروقی صاحب، میرے خیال میں کسی کے پاس نہیں ہے، جیسے اس کا جواب کسی کے پاس نہیں ہے کہ وہ فن پارے کیا ہیں انہیں قصیدہ نہیں کہہ سکتے، غزل نہیں کہہ سکتے، لیکن ان میں آہنگ کی فراوانی ہے اور یہ **decode** کرنا بہت مشکل ہے کہ وہ فراوانی کثرت مفہوم کی بنا پر ہے یا الفاظ کے نئے پن کی بنا پر ہے، یا خود الفاظ کے اپنے آہنگ کی بنا پر ہے۔

نیّر: اس کی بہت اچھی مثال ''ساقی نامہ'' ہے۔ روانی اور تسلسل بھی ہے، فکر اور کثرت معنی بھی ہے اور الفاظ کی غنائیت بھی ہے۔ لیکن یہ وہ مسئلہ ہے جو ہم لوگوں کو حل کرنا بھی نہیں ہے کہ یہ آہنگ کس طرح پیدا ہوتا ہے۔ رہ گیا یہ طریقہ کہ ایک لفظ کو، جیسے کسی نے کہا بھی ہے کہ ''نیکر کا خرام بھی سکوں ہے'' والی نظم میں کچھ حرفوں ۔۔۔

فاروقی: ارے وہ کہاں، ''دریا کے خموش ۔۔۔'' ش ش اور وہ ۔۔۔

عرفان: بس اس آہنگ سے ہم لطف اندوز بھی ہوں۔ اگر اتنا ہو جائے تو میں سمجھتا ہوں تفہیم کا ہمارا ایک مرحلہ سر ہو جائے گا۔

شمس الرحمٰن فاروقی: ہاں، بس

نیّر مسعود: بس، اتنا کافی ہے۔

عرفان صدیقی: بہت بہت شکریہ۔